ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد*

علامہ اقبالؔ کے چند فارسی اشعار کی غیر مطبوعہ شرح

Unpublished interpretation of some Persian verses of Allama Iqbal

abstract

Understanding the thought-provoking and philosophical poetry of Iqbal is not easy for any level of reader, because the formation of Iqbal's ideas includes many kinds of intellectual schools and sources. The main source of Iqbal's thought is the Holy Qur'an. A vast world of meaning is hidden in his similes, metaphors, allusions, and compounds, which cannot be understood without deep study and extensive knowledge. This is the reason that the interpretation of Iqbal's poetry started during his life. Among the early interpreters of Iqbal's poetry were those who had the opportunity to meet Iqbal and sit in his gatherings, and all of them were fully aware and familiar with the meaning of Iqbal's message of poetry.

Among these commentators of Iqbal, the names of Maulana Ghulam Rasool Mehr, Yusuf Saleem Chishti and Sufi Ghulam Mustafa Tabassum are especially worth mentioning. Sufi Ghulam Mustafa Tabassum was an eminent poet, writer and scholar of Persian, Urdu and Punjabi. Apart from articles and books, he presented hundreds of programs on Radio Pakistan to make the new generations aware of Iqbal's message.

Although his interpretations have been published in the form of various books, some of his interpretations remain unpublished. Through this article, unpublished interpretations of five Persian poems of Iqbal are being presented for the first time.

Key words: Allama Iqbal, interpretation, Sufi Ghulam Mustafa Tabassum, Persian Poetry, Thought provoking,

صوفی غلام مصطفی تبسم [۱۸۹۹ء تا ۱۹۷۸ء] بیسویں صدی کے اکابر تخلیق کاروں میں شامل ہیں۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی تخلیقی صلاحیت سے نوازا تھا؛ علم وادب کے مختلف شعبوں میں اُن کی فعال کار گزاری اُن کی اسی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا کرشمہ ہے۔ بچوں کے ادب میں

☆ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اُن کی نگارشات کو درجۂ اعتبار واستناد حاصل ہے۔ انھوں نے بچوں کی نفسیات، کیفیات اور مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے جو ادب تخلیق کیا وہ اپنے رنگ، رس، تاثیر اور ذائقے کے اعتبار سے منفرد اور بے مثال ہے۔ اس کے علاوہ شاعری، نثر، شرح نویسی، غالب شناسی، اقبال شناسی، شعر فہمی، ترجمہ کاری اور تدریس کے شعبوں میں بھی انھوں نے لازوال اور یادگار کارنامے انجام دیے۔ فارسی، پنجابی، اُردو اور بعض دوسری زبانوں پر وہ قدرت رکھتے تھے اور ان زبانوں کے ادبی اور لسانی سرمائے پر ان کی گہری نظر تھی۔ بسیط مطالعے اور مختلف زبانوں کے شعر وادب سے گہری شناسائی کے باعث وہ شعر فہمی کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے منظوم ومنثور تراجم اور بعض شعرا کے کلام کی تشریحات سے اُن کی شعر فہمی کی اس منفرد اور مثالی صلاحیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

صوفی تبسم، عہد آفریں شاعر اور مفکر حضرت علامہ محمد اقبالؒ کی شخصیت اور فکر سے بہت متاثر تھے۔ انھیں اقبال کی مجالس میں بیٹھنے اور اُن سے ہم کلام ہونے کے کئی مواقع ملے اور اُن کا کلام سُننے اور پس منظر جاننے کے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فکرِ اقبالؔ سے کماحقہ 'واقفیت رکھتے تھے اور شعر اقبال کی غرض وغایت سے بھی وہ بہ خوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے نظم ونثر میں فکرِ اقبالؔ کی تفہیم، تعبیر اور تشریح کا فریضہ صحیح خطوط پر انجام دے کر نسلِ نو کو پیغامِ اقبالؔ سے آشنا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ تنقیدی اور تشریحی مضامین کے علاوہ انھوں نے اقبال کے مشکل اور دقیق اُردو اور فارسی اشعار کی شرح نویسی کا کام بھی انجام دیا۔ اس میں شُبہ نہیں کہ اقبالؔ کے فارسی اور اُردو کلام کی کئی تشریحات اور شروح لکھی گئی ہیں اور کلامِ اقبال کے شارحین میں ایسے اصحابِ علم ونظر بھی شامل ہیں جو اقبالؔ اور کلامِ اقبالؔ سے کامل آشنائی رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود صوفی غلام مصطفیٰ تبسمؔ کی منتخب کلام کی شرحیں افادیت، تاثیر اور ذائقے میں دوسری شروح پر تقدم اور فضیلت رکھتی ہیں۔ صوفی تبسم چوں کہ ایک اعلا درجے کے استاد تھے اور موثر تدریس کے اجزائے ترکیبی سے انھیں پوری واقفیت تھی، اس لیے ان کی تشریحات میں ایسے اجزا گندھے ہوئے ہیں، جو تفہیم کے نئے در وا کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ صوفی تبسم کی شرح نویسی کا اسلوب نہایت سادہ، رواں دواں اور غیر مبہم ہے۔ صوفی تبسم اشعار کی تشریح کرتے ہوئے تاریخی واقعات، اہلِ علم ودانش کے اقوال اور اساتذہ کے برمحل اشعار پیش کرتے ہیں۔ اس رنگِ تشریح سے اشعار کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور قاری کو شعر کی تہ داری سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد نئی نسلوں کو اقبالؔ کی آفاقی فکر اور ان کے پیغام سے متعارف کرانے کے لیے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے ریڈیو پاکستان سے بعنوان ''اقبالؔ کا ایک شعر'' سلسلہ شروع کیا۔ اقبالؔ کے مشکل اور دقیق اُردو اور فارسی اشعار اور قطعات پیش کیے گئے۔ ریڈیو پاکستان پر پیش کردہ منتخب اشعار کی تشریحات نے نوجوانوں میں ولولۂ تازہ بیدار کرنے اور انھیں فکرِ اقبال سے متعارف کرانے کا فریضہ انجام دیا۔ اس متاعِ بیش بہا کو آئندہ نسلوں کے واسطے محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور ۱۹۷۷ء میں اقبالؔ کے صد سالہ یومِ ولادت کے موقعے پر ''شرح صد شعر اقبال: اُردو'' کی اشاعت مرکزی اُردو بورڈ، لاہور کے ذریعے عمل میں آئی۔ اسے جلد اوّل قرار دیا گیا اور اشفاق احمد نے اپنے پیش لفظ ''نذرانۂ عقیدت'' میں لکھا کہ اقبال کے فارسی اشعار کی شروح کی اشاعت ضروری ہے۔ تاہم فارسی اشعار اور قطعات کی شروح کو مرتب ہونے میں بہت وقت لگ گیا۔ ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر وحید قریشی، ناظم اقبال اکادمی، لاہور کی تحریک وتشویق پر صوفی تبسم کے بیٹے پروفیسر صوفی گلزار احمد نے ''صد شعر اقبال: فارسی'' کے عنوان

سے انہتر اشعار اور اکتیس قطعات کی شروح کو یک جا کر کے اقبال اکادمی، لاہور سے شائع کیا۔ اگرچہ کتاب پر مرتب کی حیثیت سے صوفی گلزار احمد کا نام درج ہے تاہم مرتب کی ذمہ داری کو انھوں نے پورا نہیں کیا۔ انھوں نے محض ایک صفحے کا ابتدائیہ ''عرضِ مرتب'' کے عنوان سے تحریر کیا جس میں وحید قریشی صاحب کی تحریک پر اس کام سے عہدہ برا ہونے کا ذکر اور مستقبل میں صوفی تبسم کی غیر مطبوعہ تحریروں کو یکجا کرنے اور اشاعت آشنا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر عبید اللہ خان کی تحریر شامل ہے۔ اس تحریر میں انھوں نے صوفی تبسم کی شروح اور اشعار کے انتخاب کے بارے میں اجمالی تبصرہ کیا ہے۔ اشعار کے انتخاب کے بارے میں انھوں نے لکھا:

''ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفی تبسم صاحب نے علامہ اقبال کے ان اشعار کو نشر کرنے کے لیے منتخب کیا ہے، جن سے جوان نسل میں ایک ولولۂ تازہ اور جذبۂ نو بیدار ہو۔ یہ نسل ان اشعار کی روشنی میں اپنی کردار سازی کر سکے اور عمل کا پیکر بن کر ایک سچی اور محبِ وطن قوم بن کر ابھرے۔ ان اشعار کے انتخاب سے صوفی صاحب مرحوم کی قومی و ملی لگن اور حب الوطنی کے جذبہ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر عبید اللہ خان نے اسی تعارفیے میں یہ انکشاف بھی کیا:

''راقم (ڈاکٹر عبید اللہ خان) نے بڑی محنت سے ان اشعار کے صحیح نقل ہونے کی طرف توجہ دی ہے۔ نقل ہونے میں بعض اشعار میں غلطیاں رہ گئی تھیں، انھیں درست کیا ہے۔ بعض جملوں میں الفاظ چھوٹ گئے تھے، انھیں پورا کیا ہے۔ نقل کرنے والے صاحب سے بعض اشعار غلط نقل ہو گئے تھے، انھیں صحیح کیا گیا ہے۔ یہ سب کام راقم الحروف نے کلیاتِ فارسی کو سامنے رکھ کر پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ یہ بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر شعر کے بعد بریکٹ میں اس کی نشان دہی کر دی جائے کہ وہ شعر یا قطعہ اقبالؔ کے کس مجموعۂ فارسی سے لیا گیا ہے۔''(۲)

گویا مرتب کی ذمہ داریاں ڈاکٹر عبید اللہ خان نے انجام دی ہیں۔ تاہم ترتیب کے تقاضے پورے نہیں کیے گئے۔ مثال کے طور پر ''صد شعر اقبال فارسی'' میں حواشی کا التزام نہیں کیا گیا، جس کی کہیں کہیں ضرورت تھی۔ یہ اشعار اور قطعات جس ترتیب سے نشر ہوئے، اس ترتیب سے انھیں شاملِ کتاب نہیں کیا گیا بلکہ بہ قول ڈاکٹر عبید اللہ خان، صوفی گلزار صاحب نے غالباً موضوع کے اعتبار سے انھیں مرتب کیا ہے۔ اگر انھیں موضوع کے اعتبار سے مرتب کرنا ضروری تھا تب بھی ہر شعر کے بعد جہاں اس کا ماخذ درج ہے، وہاں اس کی تاریخِ نشر درج کی جانی چاہیے تھی۔ اگرچہ ڈاکٹر عبید اللہ خان نے ''بڑی محنت'' سے اشعار نقل کرنے کا ذکر کیا ہے مگر اشعار و قطعات کا متن اس ''بڑی محنت'' کی گواہی نہیں دیتا۔ تمام اشعار و قطعات میں کہیں بھی حرفِ اضافت کا التزام نہیں کیا گیا۔ بغیر اضافت کے شعر پڑھنا طلبہ اور عام قارئین کے لیے کس درجہ مشکل ہے، اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اشعار کا متن بھی درست نہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

درست: ولے چشمیکہ بیناشد، نگاہش بر دل افتاد است

درست: تب و تاب از جگرِ لالہ ربودن نتواں

☆ ملت از افراد می پابد نظام ص ۶۴

درست: ملت از افراد می یابد نظام

☆ کار دانش رابقا از مدعاست ص ۸۴

درست: کار وانش رابقا از مدعاست

☆ سفالم رائے او جام جم کرد ص ۲۳۳

درست: سفالم رامیِ او جامِ جم کرد

صوفی غلام مصطفی تبسم کے تخلیقی اور علمی سرمائے کو پوری طرح یک جا نہیں کیا جا سکا۔ یہی وجہ کہ اُن کی بہت سی تحریریں ہنوز غیر مطبوعہ اور غیر مدون حالت میں موجود ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے ''اقبال کا ایک شعر'' نامی سلسلہ طویل عرصہ تک نشر ہوتا رہا۔ اس لیے سو اُردو اور سو فارسی اشعار کی مطبوعہ شروح کے علاوہ بھی کئی ایسے اشعار اور قطعات موجود ہیں، جن کی شرح صوفی تبسم نے اپنے پروگرام میں پیش کی۔ راقم کو پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی [م: ۲۰۰۷ء] کے کاغذات سے کُچھ عکسی نقول (بہ خطِ صوفی تبسم) حاصل ہوئیں۔ ان کاغذات میں اس سلسلے میں پیش کیے گئے چند فارسی اشعار اور قطعات کی نقول بھی شامل ہیں۔ ان میں پانچ اشعار اور چھے قطعات ایسے ہیں جو ''صد شعر اقبال: فارسی'' میں شامل نہیں۔ زیرِ نظر مضمون کے ذریعے اقبال کے پانچ فارسی اشعار کی شرح پہلی بار پیش کی جا رہی ہے۔

نو دریافت شرحیں فل اسکیپ سفید کاغذ پر بہ خطِ صوفی تبسم تحریر شدہ ہیں۔ صوفی صاحب کا سوادِ تحریر دل کش اور خوب صورت ہے۔ مختلف مقامات پر کاٹ پیٹ اور تصحیحات سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ تحریریں قلم برداشتہ ہیں۔ شرح میں دوسرے شعرا کے بر محل اشعار پیش کیے گئے ہیں، ان پیش کردہ اشعار کے متن میں کہیں کہیں فرق ہے۔ صوفی صاحب کے حافظے میں شعر جس طرح محفوظ تھا، اسی طرح درج ہو گیا ہے۔ راقم الحروف نے ایسے اشعار کا متن درست کر کے حواشی میں اس کی صراحت کر دی ہے۔ اسی طرح بعض الفاظ کا املا بھی رسمِ قدیم کا پابند تھا جسے جدید املا میں تبدیل کر دیا ہے۔ اشعار اور قطعات پر تاریخِ نشر تحریر ہے، اس لیے زیرِ نظر مضمون میں بھی ان تاریخوں کو شامل کیا گیا ہے اور شروح کو تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اشعار اور قطعات کا متن جدید فارسی املا کے مطابق نہیں کیوں کہ صوفی صاحب کے بعض نتائج قدیم املا سے مستخرج ہیں۔ البتہ یہ اشعار اور قطعات اقبال کے جس مجموعہ کلام میں شامل ہیں، ان کا ذکر حوالہ جات میں کر دیا ہے۔

اشعار کی شرح:

[۱]

بہ چشمِ ہر چہ ہست و بُود و باشد

دمے از روزگارِ آرزوئے **(۳)**

[تاریخ نشر:۱۵/ستمبر ۱۹۶۵ء]

اس شعر کے لفظی معنی یہ ہیں:

میری نگاہ میں جو کچھ اس دُنیا میں ہے، جو کچھ اس دُنیا میں تھا اور جو کچھ اس دُنیا میں آئندہ ہوگا وہ سب کچھ میری تمنّاؤں کی زندگی کا ایک لمحہ ہے اور بس۔

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب ''آبِ حیات'' میں انشا کے تذکرے کے ذیل میں اُن کی زندگی کی خوش حالیوں اور مابعد کی تلخیوں کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انشا کو قدرت کی طرف سے کچھ قہقہے ودیعت کیے گئے تھے، وہ انھوں نے چند دنوں میں ختم کر دیے۔ یہ بات، مولانا آزاد مرحوم نے ایک لطیفے کے طور پر کہی تھی اور اس کے لیے ایک خوب صورت فقرہ چُست کیا تھا لیکن شاید انھیں معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی اس شوخ بیانی میں ایک نفسیاتی حقیقت کو بیان کر گئے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات اس قسم کے نفسیاتی تجزیے کو ایک وارداتی لمحے کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ لمحہ جس میں انسان کی ساری وارداتی یا جذباتی زندگی سمٹ آتی ہے۔ حافظ کا ایک شعر ہے:

بفراغِ دل زمانے، نظرے بہ ماہ روئے

بہ ازاں کہ چترِ شاہی ہمہ عمر ہاؤ ہوئے(۴)

یعنی محبوب کی صحبت میں فراغت کا ایک لمحہ اُس تمام زندگی پر بھاری ہے جو شاہی ہنگامہ آرائیوں میں بسر ہو۔ اقبال بھی اسی نوعیت کے تجربے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے اس شعر میں کہتا ہے کہ اس وارداتی لمحے میں جہاں تمنّا اور آرزو اپنی ساری عمر گزار لیتی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل سبھی سموئے ہوتے ہیں۔ غزل کے ایک خوب صورت شعر میں اقبال اسی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

منزلِ عشق بسے دُور و دراز است ولے

طی شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے(۵)

یعنی سفر عشق بہت دُور و دراز ہے لیکن کبھی کبھی یہ سو سالہ مسافت ایک آہ کھینچتے طے ہو جاتی ہے۔ عمر بھر کی گریہ زاری سمٹ کر ایک آہ میں سما جاتی ہے اور اس ایک آہ میں عاشقانہ زندگی کے تمام درد و کرب بھر جاتے ہیں۔

آنحضرت کے پاس جب پہلے پہل نزلِ وحی ہوا اور ان سے ''اقرا'' کے لفظ دہرانے کے لیے کہا گیا، انھوں نے اپنے اُمّی ہونے کا اظہار کیا، اس پر جب اصرار ہوا اور انھوں نے اس آیت کو دہرایا تو اس ایک لمحے میں اُن کی زندگی، اُن کی شخصیت یکسر بدل گئی۔ اس ایک لمحے میں اُن کا ماضی، حال اور مستقبل اُن پر بہ یک وقت منکشف ہو گیا۔ تبدیلِ دین کا لمحہ ایسا ہی لمحہ ہوتا ہے جسے انگریزی زبان میں conversion کہا جاتا ہے جو خود شناسی ہی کا دوسرا نام ہے۔

اب ذرا اس شعر کے فنی محاسن اور شاعرانہ نکتہ آفرینیوں پر توجّہ کیجیے، جن کا اطلاق اُس نے وقت کی کل کائنات پر کیا اور بڑے اختصار اور حسن وخوبی سے کیا ہے۔ اقبال کا تصور وقت کے بارے میں یہ ہے کہ اس میں دوش و فردا کوئی شے نہیں۔ وقت ''ابدی حال'' ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے انسان! گزرا ہوا کل اور آنے والا کل کوئی شے نہیں۔

فقط امروز ہے تیرا زمانہ

اس لیے جب وہ ہست و بود و باشد کے لفظ کہتا ہے تو وہ ہست کے لفظ پر زور دیتا ہے اور اُسے روز گارِ آرزو کے ایک لمحے سے منسوب کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آرزوؤں اور تمنّاؤں کے زمانے میں موجودہ لمحہ ہی اصل شے ہے جس میں انسان کی ساری زندگی سمٹ کر رہ جاتی ہے۔

اقبال نے ''روز گارِ آرزو'' کا ایک ایسا پُر معنی اور بلیغ لفظ استعمال کیا ہے کہ اسے چھیڑتے ہوئے اور اس کی تشریح کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ایک آرزو کیا ہے گویا زندگی کا ایک پورا زمانہ ہے اور اس زمانۂ آرزو کا ایک لمحہ ایک ایسا بھرپور لمحہ ہے کہ جس میں ماضی، حال اور مستقبل سبھی سمائے ہوتے ہیں۔

[۲]

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکی است

بوریا و مسندِ دیبا یکی است(۶)

[تاریخِ نشر: ۲۱/ اکتوبر ۱۹۶۵ء]

قرآن کی نظر میں بندہ وآقا دونوں برابر ہیں۔ ایک مردِ فقیر کا بوریا اور شاہنشاہ کی مسندِ کم خواب میں کوئی فرق نہیں۔

داستان یہ ہے کہ ایک فرماں روائے باوقار سُلطان مراد اپنے ایک انجینیئر کو ایک مسجد کے تعمیر کرنے پر مامور کرتا ہے۔ مسجد تیار ہوئی تو سُلطان مراد اسے دیکھ کر ناپسند کرتا ہے اور غیظ وغضب میں آکر اس ماہرِ تعمیر فن کار کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم صادر کرتا ہے۔ وہ مظلوم اپنی فریاد، قاضیِ شہر کے پاس لے جاتا ہے اور کہتا ہے میں تیری عدالت میں حاضر ہوا ہوں، تُو شریعتِ اسلامی کا نگہدار ہے۔ میں شاہنشاہوں کا غلام نہیں ہوں، دینِ اسلام کا پرستار ہوں، مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ انصاف چاہتا ہوں۔

قاضی نے اُس کی فریاد سُنی اور بادشاہ کو اپنی بارگاہِ انصاف میں طلب کیا۔ بادشاہ حاضر ہوا، وہ خطاکاروں کی صف میں کھڑا تھا۔ قرآن پاک کو دیکھ کر اُس کا رنگ فق ہو گیا، شرم سے اُس کی آنکھیں جھک گئیں۔ ایک طرف مدعی تھا دوسری طرف شہنشاہِ عالی وقار اور درمیان میں قُرآن۔

قاضی نے بہ آوازِ بلند قرآنِ پاک کی یہ آیت پڑھ کر سُنائی وَلَکُم فی القصّاص حَیوٰۃ یا اَولی الالباب (۷)اور کیا یہ قانونِ الٰہی ہے اور اس قانون سے زندگی کو ثبات حاصل ہے۔ ایک عبدِ مسلم احرار سے کم نہیں۔ بادشاہ کا خون معمار کے خون سے زیادہ رنگین نہیں ہوتا۔

جب سُلطان مراد نے یہ بات سُنی تو بلا حیل وحجت اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ معمار نے جب یہ دیکھا تو اُس پر رقّت طاری ہو گئی وہ خاموش نہ رہ سکا۔ اُس نے بے ساختہ یہ آیت پڑھی:ان اللہ یا مُرُکُم بالعدلِ وَ الاحسان(۸)اور کہا میں نے اِسے خدا اور رسول کے صدقے معاف کر دیا۔

یہ قرآنِ پاک کی تعلیم اور آئینِ پیغمبر کی سطوت وعظمت تھی,ایک معمار کم عیار کی فتح نہیں تھی یہ دینِ اسلام کی فتح تھی۔ جس کی نظر میں بندہ و آقا ایک ہوتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب ایک مردِ مسلماں، شریعت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے تو یہی وہ وقت ہے جب ایک فرد ملّت کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فرد کی خودی، بے خودی میں کھو جاتی ہے۔ جس طرح ایک فرد ملّت کا احترام کرتا۔ اِسی طرح ملّت فرد کا احترام کرتی ہے اور اُس کے جذبات واحساسات کو اپنے احساسات کا جز بنالیتی ہے۔ فرد وملّت کا یہ ربطِ باہمی دونوں کی زندگی کے تحفظ اور استحکام کا باعث ہوتا ہے اور اِسی سے یگانگت، وحدت وثبات کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ اسلام کا یہ عظیم کارنامہ، دُنیا کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔ اسلام نے اونچ نیچ کے امتیاز کو مٹا کر تمام بنی نوعِ انساں کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا اور فرد کو ملّت اور ملّت کو فرد سے وابستہ کر کے زندگی کے ایک اساسی اصول کی بنیاد رکھی۔

[۳]

من از غمہا نمی ترسم ولیکن

مدہ آں غم کہ شایانِ دلے نیست(۹)

[تاریخِ نشر:۱۶,نومبر ۱۹۶۵ء]

اقبالؔ کہتا ہے کہ اے خدا! میں غموں سے نہیں ڈرتا لیکن مجھے وہ غم نہ دینا جو کسی دل کے شایاں نہ ہو۔

اقبالؔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مفکر بھی تھا دوسرے لفظوں میں وہ مفکر شاعر تھا۔ اس شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ اقبالؔ نے ایک بڑے اہم نکتے کو بڑی سادگی لیکن اتنے پیارے انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ شعر غزل کا شعر معلوم ہوتا ہے اور وہ چیز جسے ہم تغزّل کہتے ہیں اس میں پیدا ہو گئی ہے اور اقبالؔ کی غزلوں میں تفکر کی گہرائی کے ساتھ تغزّل کی آمیزش ہر جگہ موجود ہے اور باوجود اس کے وہ اپنے آپ کو غزل سے اس طرح بیگانہ کہ کر پکارتا ہے:

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ غزل سے آشنا میں(۱۰)

اس کے کلام میں غزل کے تمام محاسن بدرجۂ اتم موجود ہیں اور اس کا غزلیہ اسلوب اس کے ہر شعر میں جذبات کی شدت پیدا کرتا ہے اور اسے بے حد موئثر بنادیتا ہے۔

آج کے شعر میں وہ غم کا ذکر کرتے ہوئے بڑی تمکنت کے ساتھ خدا سے یہ کہتا ہے کہ میں دکھوں اور غموں سے ڈرنے والا انسان نہیں غم بڑی جانکاہ شے سہی میں اسے سینے سے لگانے کو تیار ہوں لیکن اتنی بات ہے کہ جو غم بھی میرے دل کو عطا ہو وہ میرے دل کے ظرف اور حوصلے کے مطابق اور شایانِ شان ہونا چاہیے۔ اقبالؒ کو فی الحقیقت اپنی بلند حوصلگی دکھانا مقصود میرا دل کسی ادنیٰ غم کا طلب گار نہیں حیوان اور چرند پرند یہ سب روزی کے غم میں نڈھال ہوتے ہیں اور ایسے بھی انسان ہیں جن کے دل چھوٹے چھوٹے غموں سے دکھیا نظر آتے ہیں لیکن بلند نظر اور بلند ہمت انسان ان غموں اور دکھوں کو غم اور دکھ کا نام ہی دیتا۔ اُس کے سامنے غم کسی بڑی چیز کا غم ہوتا ہے۔ وہ اُس بڑی چیز کو اپنا محبوب بنالیتا ہے اور اسی محبوب کی محبت اور تمنا اور آرزو کو اپنے دل کے خزینے میں جگہ دیتا ہے۔:

غالبؔ زندگی کو ایک سراپا درد سمجھتا ہے اور عشق کو اس درد کا مداوا سمجھتا ہے۔ دردِ عشق سے زندگی سنورتی ہے اور زندگی کے سارے چھوٹے دکھ درد، دردِ عشق سے دب جاتے ہیں۔ عشق کا اپنا درد، دردِ لا دوا ہی سہی لیکن دنیا کے سب دکھوں کا علاج تو ہے۔ مولانا رومؔ کا ارشاد ہے:

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما

اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

پیر رومی عشقِ الٰہی کو عشقِ خوش سودا کہتے ہیں یعنی وہ عشق جو ایک خوبصورت اور اچھا درد ہے اور وہ درد اس لیے حسین و جمیل درد ہے کہ زندگی کے تمام دکھوں کا مداوا ہے ر۔ یقیناً ایسا ہی دکھ، بلند ہمت اور عظیم شخصیتوں کا حصّہ ہوتا ہے اور ان کے سوا دوسروں کو نصیب نہیں ہوتا۔

فارسی میں ”ے“ کا حرف تنکیر کے لیے آتا ہے یعنی ایک مخصوص شے کو عام بنادیتا ہے۔ دل سے دِلے بن گیا تو اس سے مراد یہ ہوئی کہ کوئی سا دل۔ لیکن اقبال کے اس شعر میں دِلے کی ”ے“ تنکیری نہیں بلکہ تعظیمی ہے۔ یعنی اس سے مقصود کوئی سا دل یا عام دل نہیں بلکہ عظیم دل ہے۔ ایک ایسا دل مراد ہے جو علّوِ ہمت سے سرشار ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ:

[۴]

بہر بادے کہ آید سینہ بکشا

نگہدار آں کُہن داغے کہ داری(۱۱)

[تاریخ نشر: ۱۸/ نومبر ۱۹۶۵ء]

اقبالؔ کا یہ شعر ایک فارسی قطعے سے ماخوذ ہے، جس میں وہ لالے کے پھول کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جو ہوا بھی چلے تو اُسے آغوش میں لینے کے لیے سینہ کھول دے مگر یہ یاد رکھ کہ جو داغِ کہن تیرے سینے میں ہے، اُسے آنچ نہ آنے پائے۔ وہ داغ محفوظ رہے۔

اقبالؔ جدّت پسند بھی ہے اور علم و فن کے بدلتے ہوئے پہلوؤں کو بڑے غور سے دیکھتا ہے اور اس بات کا قائل ہے کہ وہ قوم جو زندگی کے میدان میں ترقی کرنا چاہتی ہے اُسے زمانے کی بدلتی ہوئی روش کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ اگر کوئی قوم اُس کا ساتھ نہ دے گی تو وہ اِس کارزارِ حیات میں اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکے گی۔ ایسی قوم کی حالت اُس مسافر کی طرح ہے جو قافلے سے الگ ہو کر پیچھے رہ جائے۔ زندگی کی اس تگ و دو میں ایک لحظہ کی غفلت سے سو سالہ منزل کا فاصلہ پڑ جاتا ہے۔

یعنی میں نے چاہا کہ پاؤں میں چُبھا ہوا کانٹا نکال لوں اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ محمل سو سال کی مسافت طے کر کے آگے نکل گیا ہے۔

بہر حال ایک زندہ قوم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے اور اُسی رفتار سے چلے جس رفتار سے زمانہ چل رہا ہے۔ اقبال زمانے کی زبان سے یہ الفاظ کہلواتا ہے کہ:

نہ تھا اگر تُو شریکِ محفل قصور تیرا ہے یا کہ میرا

مِرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئِ شبانہ

بہر حال زندگی کے اس سفر میں زمانے کی اس تیز رفتاری کے ساتھ چلنا بے حد لازمی ہے لیکن اقبال جہاں ہر نئے انقلاب اور ہر نئے اجتہاد کا خیر مقدم کرتا ہے وہاں وہ اِس بات کا بھی سختی سے حامی ہے کہ ایک ترقی پذیر قوم کے لیے اپنے ماضی کی روایات سے وابستہ رہنا بھی لابدی ہے کیوں کہ اِس کے بغیر کوئی قوم ترقی کی راہ میں کوئی صحیح قدم نہیں اُٹھا سکتی۔ جو قوم اپنے آپ کو اپنے اَسلاف کی روایات سے الگ کر لیتی ہے وہ زندگی کی راہ میں ڈانواں ڈول گھومتی ہے اور آئندہ سفر کی راہیں مخدوش ہو جاتی ہیں اور بسا اوقات گمراہی کا باعث بنتی ہیں۔ کسی قوم کی ترقی اور پیش رفت کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ اپنے اصلی مرکز کو بھول جائے۔ کوئی شاخ، خواہ کیسی ہی آزاد فضا میں سانس لے کر پھل پھول رہی ہو، یہ نہیں کر سکتی کہ وہ درخت سے جدا ہو جائے۔

اس میں شک نہیں کہ شاخ کے پھول اور کونپلیں فضا اور ہوا سے بہت کُچھ کسبِ حیات کرتی ہیں لیکن اگر وہ درخت سے الگ ہو جائے تو اُس کے نشو و نما کے تمام وسائل بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہی حال قوم اور اُس کی تاریخ اور قدیم روایات کا ہے جو قوم کی زندگی میں درخت کے تنے اور جڑوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اقبالؔ کا پورا قطعہ یوں ہے:

مجو اے لالہ از کس غم گساری

چو من خواہ از درونِ خویش یاری

بہر بادے کہ آید سینہ بکشا

نگہدار آں کہن داغے کہ داری

لالے کے پھول کے سینے میں ایک داغ ہوتا ہے۔ پھول کی کلی ہوا کے چلنے سے کھلتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ فضا میں جو ہوا بھی چلے تو اُسے سینے سے لگا لے ،دوسرے لفظوں میں تو اسے قبول کر لے اور کھِل جا لیکن یہ یاد رہے کہ کسی دوسرے کی کلیّتہً دست نگری درست نہیں۔ زندگی کی تعمیر کے لیے خود نگری اور خود نگہداری لازم ہے۔ لالے کے پھول سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ کھلی فضا میں اور ہوا میں جتنا چاہے لہلہا لے لیکن یہ یاد رکھ کہ جو پُرانا داغ تیرے سینے میں ہے کہیں وہ ماند نہ پڑ جائے۔ اُسے محفوظ رکھنا ضروری ہے کیوں کہ اُسی میں تیری زندگی کا راز پوشیدہ ہے اور اُسی سے تیری زندگی کی عزت اور عظمت قائم ہے۔ اگر وہ داغِ کہن مٹ گیا تو لالہ نہیں رہے گا۔

[۵]

بگیر اے سارباں راہِ درازے

مرا سوزِ جدائی تیز تر کن (۱۲)

[تاریخِ نشر: ۲۳/ نومبر ۱۹۶۵ء]

کسی شاعر نے کہا ہے:

منزلِ شوق چوں شود نزدیک

آتشِ شوق تیز تر گردد

کہ جب منزلِ شوق قریب آتی ہے تو میرے شوق کی آگ کم ہونے کی بجائے کہتا ہے ''اے سارباں منزل کی طرف جانے کے لیے کوئی راہِ دور و دراز اختیار کر تا کہ محبوب سے جدائی کی آگ، جس کے وصال کا شوق مجھے کشاں کشاں لیے جا رہا ہے، زیادہ تیز ہو جائے۔

اس شعر میں اقبالؔ نے اپنے نظریۂ حیات کو عشق و محبت کے جذبات میں سمویا ہے۔ وہ ایک عاشق کے والہانہ اندازِ مستی کو یوں بیان کرتا ہے کہ محبت کی بے تابیاں اور جدائی کی تڑپ میں جو مزہ ہے وہ وصال کی لذتوں میں نہیں۔ بلکہ عشق و محبت کی کسک ہی ایک شے ہے اور وہ کسک فراق و وصال سے بے نیاز ہے۔ سفر عشق کی راہیں کبھی ختم نہیں ہوتیں وہ ایک اور جگہ کہتا ہے:

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

زندگی ایک سفر اور سفر دراز ہے اور اسی درازیِ سفر کی لذتیں پنہاں ہیں اور یہی لذتیں سرمایۂ حیات ہیں۔ سفر کی صعوبتیں ختم ہو جائیں تو راہ رو کا سفر بے کیف ہو کر رہ جائے۔ سفر کی درازی خستگیوں اور سختیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے لیکن عالی حوصلہ اور بلند ہمت انسان ان مشکلات سے نہیں ڈرتے وہ تو بقول مرزا غالبؔ:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

پاؤں کے آبلوں سے گھبرانے کا باعث یہ ہے کہ اس میں راہ رو کے بے دل ہو کر بیٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔ راہ میں خارزار آجائے تو ان کو عبور کرنے سے سفر کی دشواری بڑھے گی اور سفر شوق تیز سے تیز تر ہو جائے گا۔ منزل پر پہنچنے کی کئی راہیں ہو سکتی ہیں۔ میرِ کارواں یا ساربان ہمیشہ وہ راہ اختیار کرتا ہے جو قریب تر ہو، اس لیے اقبال پہلے ہی ساربان کو خطاب کر کے کہتا ہے، اسے اپنے رازِ دل سے آگاہ کر رہا ہے کہ دیکھنا اس راہ پہ چلنا جو دور و دراز ہو۔ یہ دُور و دراز کا سفر ہی میرے لیے موزوں ہے کیوں کہ اس میں میرے شوق کی آگ بھڑکتی چلی جائے گی۔

اقبال کا شعر بہت سادہ ہے لیکن اس سادگی میں بڑی فنی پُرکاریاں ہیں۔ پہلے ساربان سے خطاب، گویا حسنِ خطاب ہے۔ لازمی طور پر وہی راہ اختیار کرے گا جو اسے جلد از جلد فارغ کر دے لیکن مسافر کی نوعیتِ سفر اور مقصدِ سفر کچھ اور ہے، اس کے نزدیک منزل سے زیادہ سفر عزیز ہے۔ اس کی نظر منزل پر نہیں، سفر کی لذتوں پر پڑ رہی ہے، وہ وصال کی آسودگی کا خواہاں نہیں جدائی کی تڑپ کا خواہاں ہے۔

اقبالؔ نے "راہِ درازِ" کے الفاظ میں دراز کے ساتھ "ے" کا حرف ڈال کر اس کے معنی میں گہرائی پیدا کی ہے۔ یہ "ے" یائے تنکیری ہے۔ بہ ظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی سی دراز راہ لیکن اس "ے" میں راہ کی عظمت پوشیدہ ہے کیوں کہ راہِ دراز ایک عظیم راہ ہے۔ ایک ایسی راہ جو مسافر کے شایانِ شان ہے۔ پھر لفظ درازے میں "ے" کی موسیقیت کو دیکھیے کہ اس کے تلفظ میں "ے" کی صوتی درازی سفر کی طوالت کا احساس پیدا کر رہی ہے۔ دوسرے مصرعے میں اقبالؔ نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے جذبات کو چند لفظوں میں یوں بھر دیا ہے گویا کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔

حوالہ جات:

ا۔خان، عبید اللہ، ''کچھ صد اشعار فارسی کے بارے میں''، صد شعر اقبال: فارسی، (لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۵ء)، ص ۳

۲۔ ایضاً: ص ۵۔

۳۔اقبال، محمد، ۱۹۹۴ء، کلیاتِ اقبال فارسی (پیامِ مشرق؛ قطعہ ۱۱۵)، (لاہور، اقبال اکادمی پاکستان) ص ۲۳۰۔

۴۔حافظؔ کا مصرعِ ثانی یوں ہے:

بہ ازاں کہ چترِ شاہی ہمہ روز وہائی وہوئی

رک: دیوانِ حافظ، اسلام آباد، مرکزِ تحقیقاتِ فارسی ایران وپاکستان، ۱۹۷۹ء، ص ۵۲۱۔

۵۔ مصرعِ اوّل کی درست صورت یہ ہے:

وادیِ عشق بسی دور ودراز ست ولی

رک: اقبال، محمد، ۱۹۹۴ء، کلیاتِ اقبال فارسی (زبورِ عجم؛ بہ خوانندۂ کتاب زبور)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۳۵۲۔

۶۔ اقبال، محمد، کلیاتِ اقبال فارسی (رموزِ بے خودی؛ حکایتِ سلطان مراد و معمار در معنی مساواتِ اسلامیہ)، (لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴) ص ۱۱۹

۷۔ پوری آیۂ کریمہ یہ ہے:

وَلَكُم فِى الْقِصَاصِ حَيٰوة'' يَا أُولِى الْأَلَبابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَO

القرآن: پارہ ۲، آیت: ۱۷۹۔

۸۔ پوری آیۂ کریمہ یہ ہے:

اِنَّ اللهَ يَاْ مُرُ بِالْعَدْلِ وَالِاحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِى الْقُربىٰ وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآ ئِ وَ الْمُنْكَرِوَالْبَغْيِ ج يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَOالقرآن: پارہ ۱۴، آیت ۹۰۔

۹۔اقبال، محمد، "کلیاتِ اقبال فارسی" (ارمغانِ حجاز؛ حضورِ حق)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴) ص ۲۷۷

۱۰۔ درست مصرع یوں ہے:

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں

رک: اقبال، محمد، ۲۰۰۴ء، کلیاتِ اقبال اُردو (بالِ جبریل؛ حصّہ اوّل)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۳۵۵

۱۱۔ اقبال، محمد، ۱۹۹۴ء، کلیاتِ اقبال فارسی (ارمغانِ حجاز؛ بہ یارنِ طریق)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ ۱۹۹۴ ص ۸۶۴

۱۲۔ ایضاً: ص ۸۶۷۔